مختلف زمانوں میں مختلف اقوام نے مختلف اقسام کے تمدّن پیدا کئے ہیں۔ علوم وفنون، رسوم و رواج ذہنی اور مادی تخلیقات، سب کی معجون مرکّب کا نام تمدّن ہے۔ کسی ایک اندازِ حیات پر زندگی بسر کرنے والی ایک جماعت کو عربی زبان اور قرآنی اصطلاح میں اُمت کہتے ہیں اور اُمتوں کی نسبت قرآنِ کریم نے ایک کلّی نظریہ بیان کیا ہے جس میں کوئی استثنا نہیں اور وہ یہ ہے کہ:

"ولکل امۃٍ اجل، اذا جاء اجلھم لا یستاخرون ولا یستقدمون"

فرد کی طرح ہر اُمت کی بھی ایک مدّتِ عمر ہے اس کے بعد اس کی موت آجاتی ہے

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے سب افراد یک بیک کسی حادثے میں فنا ہو جاتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ان کا پہلا اندازِ حیات اور نظامِ زندگی حیات آفریں نہیں رہتا۔ ان کی زندگی میں ایسا انقلاب ہوتا ہے کہ شعبۂ حیات یا تو مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے یا اس کی صورت بدل جاتی ہے۔ اس تبدیلی میں کبھی تو اُمت تغیرِ احوال سے مطابقت پیدا کر کے پہلے سے بہتر حالت میں آجاتی ہے۔ اور کبھی جمود و ہٹ دھرمی یا بداخلاقی کی وجہ سے مغلوب، بے بس اور پس ماندہ ہو جاتی ہے۔ پُرانے طریقے جو دیر تک فائدہ بخش رہے اندرونی اور بیرونی تغیرات کی وجہ سے ضرر رساں ہو جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو انگریز شاعر ٹینی سن نے نہایت عمدگی سے چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے:

Old order changeth, yielding place to new,
And God fulfils Himself in many ways;
Lest one good custom should corrupt the world.

ہر قوم کے تمدن میں عروج کی حالت میں بھی کچھ خوبیاں ہوتی ہیں اور کچھ خرابیاں۔ مشہور المانوی فلسفی ہیگل اور ہمارے حکیم شاعر غالبؔ دونوں نے حیاتِ انسانی کا ایک قانون بیان کیا ہے کہ تخریب تعمیر کے بعد ہی نہیں آتی بلکہ ہر تعمیر میں اور ہر نظامِ حیات میں ابتدا ہی سے تخریب کا سامان بھی مضمر ہوتا ہے جو ایک خاص مدّت کے بعد نمایاں ہو کر تعمیر و ترکیب پر غالب آجاتا ہے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اسی خیال کو اقبال نے ذرا بدل کر اس شعر میں ادا کیا ہے:

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی

آئیے اس زاویۂ نگاہ سے مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے تمدّن پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔ ایک زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی تہذیب بھی دیگر اقوام سے بہتر تھی اور ان کا تمدّن بھی زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ ان کے اخلاق

بحیثیت مجموعی دیگر اقوام سے اچھے تھے۔ ان کے قوانین عادلانہ تھے۔ وہ دیگر اقوام اور ادیان کے ساتھ رواداری کا سلوک کرتے تھے۔ وہ ہر قسم کے علم کے شائق تھے۔ سینٹ پال کا ڈین اور مشہور مفکر و مصنف تھیوکریسز یعنی دینی حکومتوں پر ایک مضمون لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ عام طور پر تاریخ میں یہی دکھائی دیتا ہے کہ دینی حکومتیں حصولِ علم سے گریز کرتی ہیں مگر مسلمانوں کی حکومتیں جو اپنی بنیاد دینی قرار دیتی تھیں، اس کلیہ سے مستثنیٰ نظر آتی ہیں۔ ان لوگوں کو علم کی بھوک اور پیاس ایسی شدید تھی جس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی۔ لیکن کوئی چھ صدیوں کے علمی اور فنی عروج کے بعد اس اُمت کو بھی زوال آیا۔ اس کے عروج و زوال کے اسباب پر ابھی تک دنیا کے مفکرین متفق نہیں ہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ تاتاریوں کی غارت گری کے بعد مسلمان تہذیب و تمدن میں اپنا کمال اور اپنی خلاقی کھو بیٹھے۔ چودھویں صدی عیسوی کے قریب فرنگ میں زندگی نے ایک کروٹ لی۔ مسلمان سوتے گئے اور اغیار بیدار ہوتے گئے۔ خود فرنگی اب اس کا اقرار کرنے لگے ہیں کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ سے قبل مسلمان یورپ کے اُستاد تھے۔ لیکن ان اُستادوں کو کیوں سانپ سونگھ گیا۔ اس کا جواب آسان نہیں۔ ہمارے دیئے سے یورپ نے اپنا دیا جلایا۔ مگر دوسرے کا دیا جلاتے ہوئے ہمارا دیا بجھ گیا:

بجھ کے شمعِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی — اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی
دورِ گردوں میں نمونے سینکڑوں تہذیب کے — پل کے نکلے مادرِ ایام کی آغوش سے

امریکہ کا مشہور خطیب اور مصنف انگرسول اپنے ایک ایڈریس میں کہتا ہے:

Civilization was first in the brain of Europe on the point of a Moorish lance.

یعنی مسلمانوں نے یورپ کو مار مار کر مہذب بنایا۔ مگر اب پدرم سلطان بود کے دعوے بے محل اور سعی خراش معلوم ہوتے ہیں:

تھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو — ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

اکبر الہ آبادی کہتے ہیں:

رہی رات ایشیا غفلت میں سوتی — نظر یورپ کی کام اپنا کیا کی
ابھی ایجن گیا ہے اس طرف سے — کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی

جیسے میں پہلے عرض کر چکا ہوں مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن میں اچھے دور میں بھی خوبیاں ہی خوبیاں نہ تھیں۔ اس میں طرح طرح کی خرابیاں بھی موجود تھیں۔ اسلام کا قائم کردہ اور تلقین کردہ

جمہوری نظام جلد ہی ملوکیت سے بدل گیا اور "لاقیصر ولاکسریٰ" کہنے والی اُمت کے حکمرانوں نے تمام پہلے قیصروں، کسراؤں اور فرعونوں کو شان وشکوہ مطلق العنانی میں مات کر دیا۔ اسلام بتدریج غلامی کی لعنت کو صفحۂ ہستی سے ملیا میٹ کرنا چاہتا تھا۔ مسلمانوں نے اس کی صورت کو کسی قدر بہتر تو بنا دیا لیکن اس کا صفایا کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ سلاطین کی مطلق العنانی کو تقدیرِ الٰہی سمجھ کر اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اور جاہل وظالم سلطان بھی ظل اللہ بن گئے۔ سوشل ڈیموکریسی تو ان کے ہاں اسلام کی تعلیم مساوات واخوت کی بدولت دوسروں سے بہتر رہی لیکن پولٹیکل ڈیموکریسی اور معاشی عدل کی طرف کسی نے رُخ نہ کیا۔ ان تمام کوتاہیوں کے باوجود وہ ایک عرصۂ دراز تک دوسری قوموں سے پیش پیش رہے۔ اس لئے کہ دوسری اقوام پر ان سے بہت زیادہ دین اور دنیا کی ظلمتیں چھائی ہوئی تھیں۔ خدا خدا کر کے طویل خفتگی کے بعد اب بیداری کے آثار نمایاں ہیں۔ انیسویں صدی میں مغربی اقوام کے غلبے نے ان کو وہ ٹھوکریں لگائیں کہ ان کی آنکھیں کھلنے لگیں:

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں — سرمہ چشم دشت میں گردِ رم آہو ہوا

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق! ہماری موجودہ نسل کو اب کیا کرنا چاہیئے۔ سب سے پہلے ہمارا فرض ہے کہ ہم اسلام کی روشنی میں تہذیب کا نصب العین معین کریں اور مہذب انسان کا جسے اقبال مرد مومن کہتا ہے کوئی واضح نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کریں۔ ہم رحمان کے بندے اور رحمۃ للعالمین کی اُمت ہیں۔ ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عدل ورحمت کو صورت پذیر کرنا ہے۔ حریت، اخوت، مساوات، آزادی، برادری اور برابری کو مسلسل ترقی دینا ہماری سیاسی، معاشی اور اخلاقی زندگی کا لائحہ عمل ہونا چاہیئے۔ ہمیں تہذیب کے بنیادی عناصر کو کسی غیر سے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہماری خفتگی کے زمانے میں اگر دیگر اقوام نے اپنی جد وجہد سے ان اقدار کو ہم سے بہتر متحقق کیا ہو تو ہمیں ان سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں بہت سے علوم وفنون دیگر اقوام سے حاصل کئے اور پھر ان کو اپنی مخصوص ثقافت کے خم میں غوطہ دے کر ان کے رنگ کو نکھار دیا۔ اس دورِ زریں میں کسی نے یہ ہتک محسوس نہ کی کہ میں دیگر اقوام سے علم حاصل کروں۔ اب بھی کوئی وجہ نہیں کہ ہم دوسروں سے ترقی یافتہ علوم کو حاصل نہ کریں۔ ہم تو اس رسولؐ کی اُمت ہیں جس نے کہا کہ علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین جانا پڑے۔ حالانکہ اس وقت چین میں مسلمان تو بستے نہیں تھے۔ اور اسلام سیکھنے کے لئے ہمیں وہاں جانے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر تمام علم صرف علمِ دین ہی نہیں۔ خود رسول کریمؐ نے فرمایا: "العلم علمان علم الابدان وعلم الادیان"

اب ہمیں ایک طرف یہ ضرورت ہے کہ ہم اپنی ملت کے نفوس میں سے احساس کہتری کو زائل کریں جو غلبۂ فرنگ نے ہم میں پیدا کر دیا اور اپنے بزرگوں کے ان کارناموں کو سامنے لائیں جن کی بدولت انسانیت کی

ثروتِ فکر میں اضافہ ہوا۔ خوبیوں کو اُجاگر کریں اور خرابیوں سے عبرت حاصل کریں۔ علوم وفنون کے حصول کی وہی پیاس پیدا کریں جو ہماری ملت کا شیوہ تھی۔ معاشی عدل میں دیگر اقوام نے جو اچھے تجربے کئے ہیں ان کو دیکھ کر اپنی معاشی حالت درست کریں۔ کیونکہ اسلام کا ایک عظیم مقصد معاشی عدل کا قیام تھا۔

اسلام جن صداقتوں کے مجموعے کا نام ہے ان کے عناصر قبلِ اسلام بھی دنیا کی مختلف اقوام میں منتشر تھے۔ اسلام نے انقلابی بات یہ کی کہ ان عناصر سے ایک نیا جاں پرور مرکب بنایا اور اس میں اپنی روح پھونکی۔ اس وقت مسلمانوں کو اپنے ثقافتی احیاء کے لئے پھر یہی کچھ کرنا ہے۔ جو قومیں علوم وفنون اور معاشرتی اور سیاسی تنظیم میں ہم سے بہت آگے نکل گئی ہیں ہمیں بے دریغ ان سے سیکھنا چاہیئے۔ زندگی کی صداقتیں اور اس کی خوبیاں کسی ایک قوم کا اجارہ نہیں۔ روحِ اسلامی یہ ہے کہ فراخ دلی سے ہر ایک سے اور ہر جگہ سے افکار واعمال کے اچھے نمونے جمع کئے جائیں، خواہ وہ اپنی قوم کے افراد میں ملیں اور خواہ دیگر قوم کے افراد میں۔ اسلامی ثقافت کی عالمگیری یہی ہے کہ وہ شرق وغرب اور امتیازِ اقوام سے بالاتر ہے۔ علم اور اچھی ثقافت کا ہر پہلو مسلمان کا گم شدہ مال ہے۔ روحِ اسلام میں ایسے میلانات اور ممکنات موجود ہیں کہ مسلمان اگر اپنی خودی کو کھوئے بغیر چاروں طرف سے فیض حاصل کریں تو یہ ملت دوبارہ اعلیٰ درجے کی ثقافت کے نمونے پیش کر سکتی ہے۔ لیکن جمود وتقلید سے نکل کر تحقیق کی طرف آئے بغیر نشاۃ ثانیہ اور وقارِ ملت قائم نہیں ہو سکتا۔ محض نقالی زندگی کا ثبوت نہیں۔ دنیا میں اب فقط دعووں کو کوئی نہیں مانتا۔ اور نہ کوئی مدعیان بلند بانگ کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہم محض اچھے ثقافتی نصب العین کا نقشہ کھینچ کر دوسروں کی نظر میں معزز نہیں بن سکتے۔ یہاں مجھے مولانا عبیداللہ سندھی مشہور انقلاب پسند، کی بیان کردہ ایک بات یاد آگئی جو قابلِ بیان ہے۔ مولانا فرماتے تھے کہ میں ماسکو میں اسٹالین سے ملا اور اس کے سامنے نصب العینی اسلامی تہذیب وتمدن کا نقشہ پیش کیا۔ جب اپنی تقریر ختم کر چکا تو اسٹالین نے پوچھا کہ کون سی قوم اس نقشے کے مطابق زندگی بسر کر رہی ہے۔ میں نے کہا کہ اس وقت تو کوئی قوم بھی اس نقشہ پر اپنی زندگی کو نہیں ڈھال رہی۔ تو اس نے مختصراً یہ جواب دیا کہ جب کوئی قوم اس پر کاربند ہوگی اور اس کا تجربہ ہو جائے گا تو پھر ہم دیکھیں گے کہ اس سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ مولانا یہ جواب سُن کر ٹھنڈے ہو گئے۔

ملت اسلامیہ کی خودی اگر فنا نہیں ہو گئی اور مسلمان فقدانِ عشق یا محرومیٔ جذبۂ حیات سے راکھ کا ڈھیر نہیں بن گیا ہے تو وہ دنیا کے علوم وفنون کو سمیٹ کر تحقیق واجتہاد سے انہیں روحِ اسلامی پھونک کر پھر ایک ایسا نمونہ پیش کرے جس سے اس وقت شرق بھی محروم ہے اور غرب بھی۔ اسلام کسی ایک زمانے کی تہذیب اور اس کے تمدن کا نام نہیں۔ یہ نمونے اسلامی اقوام میں بدلتے چلے آئے ہیں اور ہمیشہ بدلتے رہیں گے۔ زندگی کی مسابقت میں ہم کسی پہلے نقشے کو واپس نہیں

لا سکتے۔ زندگی کہیں اپنے آپ کو دُھراتی نہیں۔ صوفیہ کا مقولہ کہ تجلّی میں تکرار نہیں یا قرآن کریم کا ارشاد کہ "کل یوم ھو فی شان" تمام تاریخ انسانی پر عائد ہوتا ہے۔ یکرنگی، تکرار اور اعادہ جمادات کی صفت ہے۔ زندگی کا شیوہ نہیں۔ پانی آج بھی وہی ہے جو آدمِ اوّل کے زمانے میں تھا۔ بلکہ کروڑوں سال پیشتر جب ہائیڈروجن اور آکسیجن کی کیمیائی ترکیب نے پانی بنایا تھا۔ اس وقت بھی ہم وہی پانی پیتے اور برتتے ہیں۔ لیکن پانی بھی جو ایک بار ندی میں بہ گیا وہی پانی پلٹ کر پھر کبھی واپس نہیں آتا۔ یونان میں فلسفۂ تغیر کے امام ہیراقلیتوس کا قول ہے کہ کوئی شخص بہتی ندی میں ایک ہی پانی میں دو غوطے نہیں لگا سکتا۔ ہمارا نہ صرف اپنے ماضی بلکہ تمام نوعِ انسان کے ماضی سے ایک رشتہ ہے۔ یہ تمام ماضی شعوری اور غیر شعوری دونوں طرح سے ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہے۔ اس ماضی کے کچھ عناصر ابدی حقائق تھے جو اپنی ماہیت میں غیر متغیر ہوتے ہیں، جن کی نسبت قرآن "لا تبدیل لخلق اللہ" کہہ کر ان کو دینِ قیم قرار دیتا ہے۔ لیکن ایک ہی معنی لاتعداد صورتیں اختیار کرتا ہے۔ صورت پرستی ایک قسم کا شرک ہے اس لئے موحد وہی ہے جس کا صبح و شام کا ورد یہ ہو کہ "صورت نہ پرستم من" زندہ قومیں اپنے ماضی سے اپنا رشتہ قائم رکھتے ہوئے اپنے حال کے متعلق اجتہاد برتتی ہیں اور جب حیات اپنے ارتقاء کے لئے کسی تغیرِ صورت کی متقاضی ہوتی ہے تو وہ محض روایات کی لکیر نہیں پیٹتیں۔ انسان کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں اور ایک تعریف یہ ہے کہ وہ آگے اور پیچھے دیکھنے والی مخلوق ہے۔ آپ ماضی کو مطلقاً نظر انداز کر کے نہ اپنا حال درست کر سکتے ہیں اور نہ اپنے مستقبل کے لئے صحیح راہیں ڈھونڈھ سکتے ہیں۔ لیکن ماضی سے فیض حاصل کرنا اور بات ہے اور ماضی پرستی دوسری چیز ہے۔ محض ماضی پرستی ایک طرح سے مردہ پرستی ہے۔ تقاضائے تجدیدِ حیات میں ہم صرف عظمتِ رفتہ کے مقابر کے مجاور بن کر کوئی زندگی پیدا نہیں کر سکتے۔ "ما وجدنا علیہ آبائنا" منکروں اور کافروں کا شیوہ ہے۔ حضرت نقشبند علیہ الرحمۃ کیا خوب فرما گئے ہیں:

تا کے بہ زیارتِ مقابر عمرے گزرانی اے فسردہ
یک گریۂ زندہ پیشِ عارف بہتر از ہزار شیرِ مُردہ

صرف زندہ قومیں اپنے ماضی سے حیات افروز سبق حاصل کر سکتی ہیں۔ زمانے کے ساز بدلے گئے۔ اس کے انداز بدلے گئے۔ قدیم زمانوں میں زندگی کے مسائل بعینہٖ وہ نہ تھے جو آج ہیں، اس لئے ان کا حل بھی جوں کا توں کسی پہلے نقشے کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ زمانہ بھی ایک صحیفہ ہے جو اپنی آیات کو منسوخ کرتا رہتا ہے، لیکن قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق کوئی طریقِ عمل یا اصولِ کار منسوخ نہیں ہوتا جب تک کہ اس سے کسی قدر مشابہ یا اس سے بہتر اصول ظہور میں نہیں آتا۔ گویا از روئے قرآن عملِ تنسیخ عملِ ارتقا ہے۔ کسی دَور میں مسلمانوں کی ثقافت کیا تھی اس کا اچھی طرح مطالعہ کیجئے۔ اس کے حسن و قبح پر غور کیجئے۔ اس میں سے لازوال جواہر کو خس و خاشاک سے الگ اور صاف کر کے از سرِ نو تراشئے، تاکہ ترشے ہوئے ہیرے کی طرح اس کے ہر پہلو سے نئے رنگ کی شعاعیں نکلیں، لیکن یہ کبھی نہ بھولئے کہ تجلّی میں تکرار نہیں۔ مختلف ادوار میں اسلامی

اقوام کی ثقافت نے کئی رنگ بدلے ہیں اور ہر جگہ اسلام کی ان عناصر سے آمیزش ہوئی ہے جو کسی قوم کی تاریخ یا اس کے جغرافیہ اور مادّی وسائل کی پیداوار تھے۔ آیندہ بھی یہی ہوگا۔ جسے اسلامی ثقافت کہتے ہیں اسے مسلمان اقوام کی ثقافت کہنا چاہیئے، جو نہ کبھی یک رنگ رہی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ آج اگر انگریزی قوم مسلمان ہو جائے تو اس کی ثقافت نہ قدیم حجازی ہوگی اور نہ جدید حجازی، جس میں ابھی تک غلامی ملیامیٹ نہیں ہوئی۔ چینی مسلمان کی ثقافت افریقہ کے نیم وحشی مسلمان کی ثقافت سے جُدا ہی رہے گی۔

"چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" الاپنے کے باوجود چین اور عرب اور ہندوستان اسلام میں آکر بھی یک رنگ نہیں ہو سکے۔ اور نہ ہی انہیں ہونا چاہیئے۔ اختلاف الوان والسنہ کو قرآن نے آیاتِ الٰہی قرار دیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی وحدت کثرت آفرین بھی ہے اور تنوع پسند بھی۔ اسی طرح تمام زندگی قدیم عناصر کو برقرار رکھتے ہوئے بھی جدّت آفرین ہے۔ اسلامی ثقافت کہیئے یا مسلمانوں کی ثقافت اس میں ابداً گوناگونی پیدا ہوتی رہے گی۔ ثقافت کا کوئی ایک نقشہ ہمیشہ کے لئے قائم نہیں رہ سکتا۔ مسلمانوں کو اپنی نشاۃ ثانیہ میں ماضی، حال اور مستقبل کا رشتہ قائم رکھنا ہے، لیکن کورانہ تقلید سے گریز لازمی ہے۔ اقبال کی آرزو ہے:

طرحِ نو افگن کہ ما جدّت پسند افتادہ ایم ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

اور غالب اسی جذبے کے ماتحت دو بلیغ اشعار کہہ گیا ہے:

رفتم کہ خونگی ز تماشا برا فگنم در بزمِ رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

اور دوسرا شعر غالب کے بھوپالی نسخے میں ہے۔

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

بچت کیجئے

اپنی روز افزوں ضروریات کیلئے

انسانی ضروریات روز بروز بڑھتی رہتی ہیں۔ بچوں کی تعلیم کا خرچ ہو۔ بیماری کی صورت میں علاج معالجہ کی ضرورت ہو۔ شادی بیاہ کے اخراجات ہیں۔ مکان بنوانے ان سب با درکشی اور ناگہانی طور پر آنے والی ضروریات کیلئے روپیہ درکار ہے۔ اگر پس انداز کیا ہوا روپیہ موجود ہو تو یہ سب ضرورتیں بغیر دقت اور تردد کے پوری ہو سکتی ہیں۔

کل کی ضروریات کیلئے آج بچت کیجئے۔ اپنی بچت کو محفوظ رکھنے اور ضرورت کے وقت آسانی سے میسر آ سکنے کی خاطر اسے ڈاکخانہ کے سیونگ بنک میں لگائیے۔ ڈاکخانے کے سیونگ بنک ہر شخص کیلئے خواہ وہ امیر ہو یا غریب پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ یکساں کارآمد ہیں۔ ان کا طریق کار حد درجہ سہل ہے۔ منافع کی شرح نہایت معقول ہے۔ یہ منافع انکم ٹیکس سے بھی مستثنیٰ ہے۔ معمولی حساب دو روپے کی مختصر سی رقم سے کھولا جا سکتا ہے اور بعد ازاں لین دین ایک روپیہ تک کی قلیل رقم میں ہو سکتا ہے۔ روپیہ جمع کرانے پر کوئی پابندی نہیں۔ جب بھی چاہو اور جس قدر بھی چاہو روپیہ جمع کرا سکتے ہو۔ عام حسابات کے علاوہ مندرجہ ذیل حسابات بھی کھولے جا سکتے ہیں۔

۱۔ مشترکہ حساب

۲۔ میعادی حساب یا مشترکہ میعادی حساب

رقم جمع کرانے اور روپیہ واپس لینے کا طریقہ نہایت آسان ہے اور حسابدار کی اپنی موجودگی ڈاکخانہ میں ضروری نہیں۔ اپنے فائدہ اور آرام کی خاطر بچت کیجئے اور اس بچت کو ڈاکخانہ کے سیونگ بنک میں لگائیے جسے گورنمنٹ کی ضمانت حاصل ہے۔ یہاں آپ کا سرمایہ ہر لحاظ سے محفوظ رہتا ہے اور اس پر معقول منافع بھی حاصل ہوتا ہے۔

بچت کیجئے اور جمع کیجئے

ڈاکخانہ سیونگ بینک

مزید تفصیلات قریب ترین ڈاکخانہ کے سیونگ بنک سے حاصل کریں

پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر

کردار کی تشکیل

قرآن مجید کی ایک آیت ہے :

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۔ (س: البقرہ ۱: ۱۸۸)

اس کا ترجمہ کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے :

"اور آپس میں ناحق ایک دوسرے کے مال کو خورد بُرد نہ کرو اور نہ اسے حاکموں کے پاس رسائی پیدا کرنے کا ذریعہ گردانو اسلئے کہ جان بوجھ کر لوگوں کے مال میں سے تھوڑا بہت ناحق ہضم کر جاؤ"

اس آیت کا تاریخی پسِ منظر بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے بھی انسان اس کوشش میں مصروف رہا ہے کہ نہ صرف ایک دوسرے کا مال خورد برد کرے بلکہ اس مال کو اُن حاکموں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بھی استعمال کرتا رہے جن کے پاس قضاوت کے لئے اُس کے خلاف شکایت پیش کی جاتی تھی۔ انسانی کردار کی تہذیب کے لئے اس آیت میں جو فہمائش پنہاں اور عیاں ہے وہ نہ صرف اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے انسانی کردار کا ایک نازیبا رُخ یہ بھی تھا کہ وہ دوسروں کا مال خورد برد کر لیتا تھا بلکہ اس حقیقت کی طرف بھی رہنمائی کرتی ہے کہ انسانی کردار کی تشکیل اور تہذیب کی اہمیت پر بھی اسلام نے کافی اصرار کیا تھا۔ میں یہ واضح طور پر معین نہیں کر سکا کہ کردار کی تشکیل اور تہذیب پر اسلامی معاشرہ میں اصرار کس طرح اور کب سے کم ہوا اور یہ اصرار محض عبادات پر کب سے اور کیسے منتقل ہو گیا۔ لیکن ایک عام ظاہر بین آدمی کی نظر سے دیکھنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آج اسلامی دنیا میں اسلامی شعائر کی پابندی میں اگر کچھ اصرار باقی ہے تو وہ صرف عبادات تک محدود ہے اور کردار کی تشکیل ثانوی لوازم کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے، کہ اسلامی ممالک کے عام باشندے اس احساس میں مبتلا ہیں کہ اسلامیوں کا کردار دوسرے لوگوں کی نسبت کہتر ہے۔ بلکہ بعض دفعہ یہ آواز بھی سُنی جاتی ہے کہ اسلام نے کردار کی عملی تشکیل کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ ظاہر ہے کہ یہ مفروضہ بدگمانی اور لاعلمی پر مبنی ہے۔ ہماری تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ فرزندانِ اسلام میں ایسے ایسے بلند کردار انسان پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے زندگی کے ہر لمحے میں اپنی بلند کرداری کے عملی نمونے بہم پہنچا کر عوام کے لئے نفسیاتی تبلیغ کے فرائض سرانجام